مجید امجد کی نظم اور عملِ خیر کا تسلسل

ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی [1]

Abstract

Majeed Amjad is a prominent figure of urdu poetry in modern era. His poetical ideology has a strong connection with the love of humanity.A great sorrow over the miseries of common man, Labourers and farmers can be seen in his poetry. He has condemned the cruel behavior of the upper class of society and has written many poems to express his anger over the said attitude. Unfortunately Majeed Amjad's poetry has not been praised from progressive point of view but infact most of the content of his poetry is much associated with progressive themes. Majeed Amjad believes that that there is a succession of goodness that has been commenced from eternity and will remain endless. He has admired this sequence in his poems through unique metaphors.

کلیدی الفاظ: اردو نظم، جدید اردو نظم، مجید امجد، عملِ خیر کا تسلسل، تنقیدی جائزہ

جدید اردو نظم کے منظر نامے پر گزشتہ چند برسوں میں مجید امجد کی اہمیت میں اضافہ واضح طور پر سامنے آیا ہے اور بعض ایسے حقائق پر مفصل گفتگو ہوئی ہے جو تاحال پوشیدہ تھے یا اُن سے بہ وجوہ صرفِ نظر کیا گیا۔

مجید امجد کی نظم کا موضوعاتی دائرہ دیکھا جائے تو اس کی وسعت اپنے بہت سے معاصر شعرا کی نسبت بہت وسیع ہے اور وہ ایک ایسے شاعر کے طور پر اپنی شناخت قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کے ہاں زندگی ایک کُل کی صورت میں موجود ہے اور وہ ہر جزو پر اس طرح تخلیقی توجہ کرتے ہیں کہ توازن کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

[1] ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

سلیم احمد نے جدید نظم گو شعرا کی ایک بڑی تعداد سے اس گلہ مندی کا اظہار کیا تھا کہ وہ محض آدھے دھڑ کی شاعری کر رہے۔(۱) خصوصاً اُن کا شکوہ ترقی پسند شعرا سے تھا جن کی توجہ اوپری دھڑ کے مسائل کی طرف تھی۔ اپنے مضمون ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں انھوں نے ان شاعروں کی تحسین کی جنھوں نے اپنے شعری موضوعات میں نچلے دھڑ کو نظر انداز نہیں کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نچلے دھڑ کو اہمیت دینے سے شاعری پورے آدمی کے ساتھ ساتھ پورے انسان کے معیار کو بھی پورا کرتی ہے یا نہیں۔ پورے آدمی کی شاعری پورے دھڑ کی شاعری ہوتی ہے لیکن پورے انسان کی شاعری پورے وجود کی شاعری ہوتی ہے اور وجود سے مراد محض انسانی وجود نہیں بلکہ وجود بحیثیت کل ہے۔ جس میں انسان، کائنات اور خدا کی مثلث پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔

اس نوع کی شاعری کی اگر روشن مثالیں دیکھنی ہوں تو صوفیا کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے جو حیاتِ انسانی کے جملہ مسائل سے لے کر کائنات اور خالقِ کائنات کے بارے میں اپنی حیرانیوں کا اظہار کرتے رہے ہیں اور زندگی کو ایک کل صورت میں دیکھتے ہوئے اپنے باطن کے فردِ کامل کے روحانی اور تخلیقی تجربات کو ایک جامع اسلوب میں رقم کرتے رہے ہیں۔

مجید امجد کے بارے میں ایسا کوئی بیان کہ وہ صوفی شاعر ہے ممکن ہے کہ نئی اور انوکھی بات محسوس ہو لیکن ان کی شاعری کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو جدید اردو نظم کے منظر نامے پر ان معدودے چند شعرا میں نمایاں نظر آتے ہیں جن کے ہاں اس مثلث کے تینوں کونے واضح ملتے ہی اور یہ کہنا قطعی طور پر درست ہوگا کہ وہ اپنی شاعری میں ایک کائناتی زاویۂ نظر (Cosmic Approach) رکھتے ہیں۔ تاریخ کے جھرونکوں سے جھانکتے ہوئے جہاں ہڑپے کے کتبے سے مسائل حیات کا ادراک حاصل کرتے ہیں وہاں '۱۹۴۲ء کے جنگی پوسٹر' کے ذریعے مستقبل کے انسان کی زندگی کو لاحق خطرات سے آگاہی دیتے ہیں۔ ''طلوعِ فرض'' میں جہاں وہ شہر کے چوک پر زندگی کے زمینی حقائق کی تصویر دکھاتے ہیں ''نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب'' میں وہ زندگی کی ان کیفیات کو ستاروں اور سیاروں میں دیکھتے ہوئے اپنے شعری تجربات رقم کرتے ہیں۔ آخر الذکر نظم میں مجید امجد کے خیالات محض ایک شعری اظہار کی سطح نہیں رکھتے بلکہ ان ہی

اسطوری تصورات اور بعض سائنسی نظریات کا عکس بھی نمایاں ہے۔

مجید امجد کی نظموں کی خاص بات میں عام آدمی کی زندگی کی جمالیات کی بھی بھر پور عکاسی کی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ اس لحاظ سے پہلا شاعر ہے جس نے انسانی زندگی کی انتہائی عام سطح کو بغور دیکھا اور اس کی جزئیات کو بالتفصیل رقم کیا۔ یہ درست ہے کہ وہ تحریکی سطح پر ترقی پسندی کے نظریے سے وابستہ نہ رہے لیکن اپنے شعری مزاج کے لحاظ سے وہ حقیقی معنوں میں ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔

بات ترقی پسند تحریک کی ہوئی ہے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ شاید غیر ضروری نہ ہو کہ اس تحریک سے وابستہ بعض دانشوروں نے نظری سطح پر کشادہ منشور کے باوجود بہت تنگ نظری کا بھی ثبوت دیا اور مخصوص شعرا کے علاوہ کسی اور تخلیق کار پر توجہ مناسب نہیں خیال کی نیز بعض ایسے لکھنے والے جو خالصتاً اس تحریک کے منشور پر پورے اترتے تھے مگر وہ زندگی کو بعض اور زاویوں سے بھی دیکھ رہے تھے؟ انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس قبیح رویے کا شکار جہاں بہت سے اہلِ قلم ہوئے وہاں اقبال اور منٹو جیسے نابغہ روزگار لکھاری بھی ہوئے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ترقی پسند ناقدین نے فیض اور اُن کے معاصرین پر اتنی توجہ کی کہ اس تحریک کے شعور کو لے کر آگے چلنے والے بعض اہم نظم نگار بھی نظر انداز ہو گئے اور آج تک وہ تنقیدی توجہ سے محروم ہیں۔ اختر حسین جعفری، ساقی فاروقی، آفتاب اقبال، شمیم سرمد صہبائی اور سعادت سعید ایسے کتنے نام ہیں جو ترقی پسند منشور کو آگے لے کر چلے لیکن ترقی پسند تنقید اُن پر کوئی توجہ نہیں کر رہی۔

مجید امجد کی ترقی پسندی نا صرف نظری سطح پر ہے بلکہ عملی سطح پر بھی ہے کہ انھیں نوآبادیاتی عہد میں اپنی بھرپور نظم ''قصریت'' کے باعث ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے علاوہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تر زندگی عام آدمی کے ساتھ ایک عام آدمی کی طرح گزاری۔ اور اس کا اظہار شعری سطور پر بھی کیا جس کی عمدہ مثالیں ''امروز''، ''طلوعِ فرض''، ''جہانِ قیصر وجم''، ''پنواڑی''، ''بس اسٹینڈ'' اور اس نوع کی متعدد نظمیں ہیں۔

دعوتِ انقلاب اور لہجے کی گھن گرج کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو مجید امجد کی بہت سی نظمیں اور غزلیں اس کی مثال بنتی ہیں۔ ''دورِ نو''، ''مشرق و مغرب'' اور اس طرح کی کئی ایک نظمیں اپنے آہنگ کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اور اگر اُن کا تقابل بعض نام نہاد انقلابی شعرا کی تخلیقات سے کیا جائے تو یہ نظمیں فکر، اسلوب

اور لہجے ہر اعتبار سے اُن سے کہیں بڑھ کر دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اعتراف بھی ضروری ہے اس نوع کی بعض نظموں میں مجید امجد اقبال سے باقاعدہ متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ خصوصاً بعض تراکیب کا قرینہ قاری کا دھیان فوری طور پر اقبال کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ نظمیں ''نظامِ کہنہ'' کے خلاف بغاوت اور ''دورِ نو'' کی تشکیل کی اُسی طرح دعوت دیتی ہیں جیسے کہ کلامِ اقبال کے بعض گوشے۔

ہماری دولت تھے، ہم خدا تھے
اور آج بھی یہ شرار پیکر
حقیقتوں کے طلسم سوزاں
یہ وسعت بحر و بر میں غلطاں
ضمیر آہن کی جلتی سانسیں
یہ ذرے ذرے کے قلب پیچاں
میں کھولتی قوتوں کے طوفاں
زمانہ ہے جن کی رو میں تنکا
جو آج بھی ہو وجود اِن کا
ہماری مٹھی میں، ہم خدا ہیں
سیاہیوں کے چھلکتے خم سے
اُبھرتی کرنوں کا حوصلہ ہیں (۲)

بعض ترقی پسند دانشوروں کو اقبال کی مذہبیت سے بھی قدرے چڑ تھی لیکن انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اقبال نے جگہ جگہ پر مذہبی اشرافیہ پر طنز کے نشتر چلائے ہیں اور یہی رویہ مجید امجد کے ہاں بھی ابھرتا ہے۔ اس کی ابتدائی جگہ عمدہ ترین مثال ''خدا'' ہے جس میں ایک اچھوت ماں کے تصورِ الٰہ کو نظم کرتے ہوئے مجید امجد نے مذہبی اشرافیہ اور امیر طبقے پر گہرا طنز کیا ہے۔ یہ طبقات خدا کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں، اس کی تصویر کشی وہ یوں کرتے ہیں:

یہ اس کو اپنی لاشیں اپنے مردے سونپ دیتے ہیں
عفونت سے بھرے دل اور گردے سونپ دیتے ہیں

جنھیں دوزخ کے زہروں میں بھگو کر بھونتا ہے وہ
جنھیں شعلوں کی سیخوں میں پرو کر بھونتا ہے وہ
یہ اس بھگوان کے دامن کو چھو لینے سے ڈرتے ہیں
اس کو اپنے محلوں میں جگہ دینے سے ڈرتے ہیں
کسی نے بھول کر اس کا بھجن گایا، یہ جل اُٹھے
کہیں پڑ بھی گیا اس کا حسیں سایا، یہ جل اُٹھے
غلط کہتا ہے تو نادان تو نے اس کو دیکھا ہے
مرے بھولے! ہماری اور اس کی ایک لیکھا ہے (۳)

نظم کے آخری مصرعے میں خدا اور غریب طبقے کے مقدر کی یکسانی کا تصور یقیں انتہائی تلخ حقائق کی طرف اشارہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح یہ طبقہ خدا کو مردے سونپتا ہے تو وہ مردے کون سے ہیں جو یہ طبقہ غربا کو دیتا ہے۔ یہ مردے دراصل وہ مردہ نظریۂ حیات ہے جس کے اندر مذہب اور معیشت سے وابستہ کئی ایک تصورات ایسے ہیں جن کے اندر قطعی طور پر زندگی نہیں ہے، مگر یہ طبقہ انھیں مقدس نیاز سمجھ کے قبول کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔

مذہبی اشرافیہ نے جن مردہ تصورات کو فروغ دے کر استحصال کو فروغ دیا۔ مجید امجید اُس کی ایک تصویر اپنی نظم ''عیدالاضحی'' میں اٹھاتے ہیں۔ اس نظم کو اگر ''خدا ایک اچھوت ماں'' کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو تخلیق کار کا مذہب سے وابستہ سرگرمیوں کے بارے میں مطمعِ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ نظم کے اختتام کے دو شعر دیکھیں:

تجھے عزیز تو ہے سنتِ ابراہیمی
تری چھری تو ہے حلقومِ گوسفنداں پر
مگر کبھی تجھ اس بات کا خیال آیا
تری نگاہ نہیں دردِ دردمنداں پر (۴)

اقبال نے بھی یہی کہا ہے:

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے (۵)

مجید امجد کی شاعری میں مذہبی اشرافیہ اور دولت مند طبقے پر طنز کئی ایک پیرایوں میں ہے جس میں تخلیق کار کی نفرت اور احتجاج دونوں رنگ موجود ہیں۔ان کی نظموں میں بطورِ خاص جس پہلو پر توجہ نظر آتی ہے وہ رویے ہیں جو طبقاتی تفاوت کے باعث معاشرے میں ابھرتے ہیں اور افراد کے مابین امتیاز قائم ہوتا ہے۔ مجید امجد کی طبقاتی تفاوت کے سلسلے میں رقم کی گئی نظموں پہ ان کا تصورِ مرگ بھی قابل توجہ ہے جس میں وہ تمنائے کثرت، رکھنے والے افرادِ ہوا و ہوس کو ان کے انجام کی تصویر دکھاتے ہیں۔ان کی نظمیں ''راجا پرجا''، ''صدا بھی مر صدا'' اور اس نوع کی بعض دیگر تخلیقات دیکھی جائیں تو وہ فنا کی تصویر کشی کرتے ہوئے طبقہ امرا کو پیغامِ مرگ سناتے ہوئے ان کے انجام سے باخبر کرتے نظر آتے ہیں۔ان نظموں میں اس طبقے کے طرز معاش، طورِ زندگی،اسلوبِ احساس اور معاصر انسانوں سے رویے پر افسوس بھی ہے، تنبیہ بھی ہے اور طنز بھی۔

مجید امجد کی مذکورہ نظموں میں ایک فلسفیانہ سطح سے ہوتا ہے تاہم بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں زندگی کی بعض سامنے کی مثالوں سے طبقہ امرا پر ایسا طنز ہے جس کی کاٹ بہت گہری ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''کوہستانی سفر کے دوران''، جس میں ایک جھکی ہوئی شاخ کے ذریعے انسانی تکبر پر حرفِ افسوس رقم کیا گیا ہے۔

تنگ پگڈنڈی سرکہسار بل کھاتی ہوتی
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آکے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے، ڈگمگاتے رہرووں کے قافلے
ایک بوسیدہ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں!

آہ! ان گردنفرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں (۶)

اشرافیہ پر طنز کا ایک پیرایہ مجید امجد کے ہاں عام آدمی کی زندگی کی حقیقی تصویر کشی بھی ہے جس کی بنیادی بیانیہ میں وہ دستیاب لمحوں کی مسرت کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کرتے ہیں اور اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مجید امجد کی شاعری لمحہٗ موجود سے مسرت کشید کرتی ہے۔ اُن کی نظموں میں میسر و موجود گھڑی وقت کے لامحدود آنات میں سب سے قیمتی اور اہم ہے۔ وہ نہ تو کسی عظمت رفتہ کی سرشاری میں رہتے ہیں نہ ہی لمحہ آئندہ کے کسی ایسے خواب میں اُلجھتے ہیں جو کہیں فنا کے بعد پورا ہونے والا ہے۔

مجید امجد کی نظمیں اس امر کی غماز ہیں کہ وہ خوشی کے التوا کے نظریے کے قائل نہیں بلکہ کسی بھی پل ملنے والی چھوٹی سے چھوٹی مسرت کو بھی وہ زندگی کی ایک بڑی قدر خیال کرتے ہیں۔ ''امروز'' اس سلسلے کی ایک اہم نظم ہے۔ ایک عام آدمی کی زندگی کی جمالیات کی عکاسی کرتے ہوئے مجید امجد نے بہت سی ایسی دلچسپ نظمیں تخلیق کی ہیں جو لمحہٗ موجود سے مسرت کشید کرنے کے سلسلے میں بہت اہم ہیں مگر اُن کی طرف خاص توجہ نہیں کی گئی مثلاً بعض فلمی اداکاراؤں پر اُن کی نظمیں اس حوالے سے بڑی پُرکشش ہیں۔ اس کے علاوہ ''کیلنڈر کی تصویر''، ''ائیرپورٹ'' اور ''ایک فلم'' ایسی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے کی ایک بڑی خوبصورت نظم ملاحظہ ہو ''جو لاہور میں'' کے عنوان سے ہے:

ڈاک خانے کے ٹکٹ گھر پر خریداروں کی بھیڑ!
ایک چوبی طاقچے پر کچھ دواتیں ___ اک قلم
یہ قلم میں نے اُٹھایا اور خط لکھنے لگا:

''پیارے ماموں جی!

''دعا کیجیے ___ خدا ___ رکھ لے ___ بھرم
''آج انٹرویو ہے! کل تک فیصلہ ہو جائے گا
''دیکھیں کیا ہو؟ مجھ کو ڈر ہے۔۔۔

اتنے میں تم آگئیں!

''اک ذرا تکلیف فرما کر پتہ لکھ دیجیے''

میں نے تم سے وہ لفافہ لے لیا، جھجکا نہیں،
''بے دھڑک'' لکھ ڈالا نے میں ''کانپتے ہاتھوں'' کے ساتھ
مختصر، رنگیں پتہ: ''گلگت میں ___ گوہر خاں کے نام!''
''شکریہ'' ___ ''جی کیسا؟'' ___اک ہنستی نگہ زیرِ نقاب
ڈاک میں خط ___! تانگہ ٹمپل روڈ کو___ قصہ تمام! (۷)

مجید امجد نے عملی سطح پر یا نظریاتی طور پر کسی تحریک کا حصہ نہ تھے لیکن انہوں نے ایک انٹرویو میں اپنی شاعری کو عمل خیر کا تسلسل قرار دیا تھااور کسی معاشرے میں اس سے بڑا عمل خیر کیا ہوگا کہ اپنے ہم عصر انسان کے حقوق کو تسلیم کیا جائے۔ اس کائنات میں دہشت و وحشت کی قوتوں کا راستہ روک کے اصل انسانی معصومیت کو تلاش کیا جائے اور لمحہ موجود کو دستیاب مسرت خیال کرتے ہوئے بہجت ونشاط کشید کی جائے۔

مجید امجد کی نظم میں جہاں طبقاتی جد وجہد ہے۔ وہاں انہوں نے عام آدمی کی زندگی کی جمالیات کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کی توجہ لمحۂ موجود کی مسرت کی طرف دلائی ہے کہ زندگی کا یہی وہ لمحہ ہے جو اس کے پاس ہے اور اسے حاصل ہونے والی بہجت کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان نظموں میں بھی بین السطور طبقۂ اشرافیہ اور صاحبانِ سطوت پر طنز ہے کہ وہ کس طرح خود کو مستقبل کے ان ارادوں کے لیے گھلاتے رہتے ہیں جو ان کی زندگی میں پورے ہونے والے نہیں۔ وہ اپنی نسل کے آنے والے افراد کی زندگیوں کے لیے فکر مند رہ کر اپنے ہم عصر انسانوں اور ان کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے کشت وخون کو فروغ دیتے رہتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ سلیم احمد کے خیال میں:

''عورت کی طرح شاعری بھی پورا آدمی مانگتی ہے۔ آپ عورت کی خوبصورتی الفاظ سے خوش نہیں کر سکتے۔ صرف زیور کپڑے اور نان نفقہ سے بھی نہیں۔ یہاں تک کہ صاف اس کام سے بھی نہیں جسے محبت کہتے ہیں اور جس کی حمد و تقدیس شاعری کا ازلی وابدی موضوع ہے۔ عورت یہ سب چیزیں چاہتی ہے مگر الگ الگ نہیں۔ انہیں ایک وحدت ہونا چاہیے۔ ناقابل تقسیم وحدت، عورت کی طرح شاعری بھی اس ناقابل تقسیم وحدت کی تلاش کرتی ہے۔ اس مضمون میں میں نئی نظم کی حقیقی قدر و قیمت کو جانچنے کے لیے یہی پیمانہ استعمال کروں گا۔ کیا نئی نظم میں کہیں پورا آدمی بولتا ہے؟ لیکن یہ بات شاید آپ کا مضحکہ انگیز معلوم ہوئی ہو۔ آدمی ہمیشہ پورا آدمی ہوتا ہے۔ پون آدمی، آدھا آدمی، چوتھائی

آدمی نہیں ہوتا۔ مجھے خود بھی یہ بات ہمیشہ بہت مضحکہ انگیز لگتی ہے۔ آدمی کسی بھی رتبہ، حیثیت، طبقہ اور پیشہ کا ہو سکتا ہے مگر اسے ضرب تقسیم کے ذریعے کسر بنانا ایک نامعقول بات ہے۔ ہم سب اپنی ماں کے پیٹ سے پورے پیدا ہوتے ہیں پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم لوئر ڈویژن کلرک کی حیثیت سے کچھ اور بن جاتے ہیں اور شوہر یا عاشق کی حیثیت سے کچھ اور آپ کہیں گے کہ یہ صرف تقسیم کار کی حیثیتیں ہیں۔ بالکل ٹھیک ہے مگر بہت سے لوگوں میں اسی تقسیم کار سے آدمی کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ سیاسی آدمی، اخلاقی آدمی، مذہبی آدمی، انقلابی آدمی، اسی قسم کے ٹکڑوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں انہیں کسری آدمی کہتا ہوں۔ کسری آدمی کائنات کی سب سے مضحکہ خیز مخلوق ہوتا ہے۔ مضحکہ خیز اور قابل نفرت اسے دیکھ کر کائنات بکر قصب کی دکان معلوم ہونے لگتی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو شاعری میں آپ کو یہ مضحکہ انگیز مخلوق مشکل سے نظر آئے گی۔ اسی لیے اس سے پہلے شاعری کی اصناف مرثیہ، قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ تھیں۔ سیاسی شاعری، اخلاقی شاعری، مقصدی شاعری کی تقسیم ناپید تھی۔ شاعری کی یہ قسمیں کسری آدمی نے پیدا کیں۔''

سلیم احمد،نئی نظم اور پورا آدمی، نفیس اکیڈمی، کراچی،۱۹۸۹ء، ص۱۷۔

۲۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، (لاہور: ماروا پبلشرز، ۱۹۹۱ء، دوسرا ایڈیشن)، ص۲۱۳۔

۳۔ ایضاً، ص۸۸۔

۴۔ ایضاً، ص۳۴۷۔

۵۔ اقبال،کلیاتِ اقبال،(لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۱۳ء، بارھواں ایڈیشن)، ص۴۱۴۔

۶۔ کلیاتِ مجید امجد،ص۱۸۸۔

۷۔ ایضاً، ص۱۷۳۔

۸۔ یوسف کامران کو انٹرویو دیتے ہوئے مجید امجد نے کہا تھا:

''یہ فلسفہ و فکر اور عقیدے تو مختلف شعرا کی شاعری کا حصہ رہے لیکن میں اسے اپنا شخصی رویہ کہوں گا جو میرے ذہن میں ایک رو کی طرح ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ایک تسلسل کی طرح ہمیشہ میری زندگی کے ساتھ رہا ہے۔ میں اسی رویے کے تابع ہو کر اپنے تمام مضامین کو زندگی کی حقیقتوں میں دیکھتا ہوں۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ تمام ممالک میں، تمام کائنات میں تمام تاریخ میں تمام ارتقاء میں ایک چیز تسلسل زندہ رہی ہے اور وہ عمل خیر کا تسلسل ہے۔ اس عمل خیر کے تسلسل کو جاری رکھنا ہر دور میں انسان کا فرض رہا ہے۔ آج بھی ضروری ہے لیکن اس کے لیے کوئی ریاضت کر سکتا ہے۔ کون اس کے لیے مجاہدہ کر سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں جتنی بھی کوشش ہو سکے ضروری ہے۔ میں نے ان واقعات کو اس

طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف ان میں سے مسرتوں کو حاصل کرے۔۔۔ یا۔۔۔ان سے متاثر ہوں کہ یہ مسرتیں مفقود ہو گئی ہے۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوتا کہ انسانی زندگی ان سچی مسرتوں سے لبریز ہو جائے جس کے لیے یہ کائنات پیدا کی گئی ہے۔ انسانوں کی زندگیوں میں ایسے لمحات ہمیشہ آتے ہیں۔ میں اس کے لیے کوشش کرتا ہوں ایسے لوگوں کی تلاش میں ہوں۔''

مجید امجد، کلیاتِ نثر، مرتبہ: ڈاکٹر محمد افتخار شفیع، (لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۹۸۔